محمد حنیف ندوی

حج کی فضیلت واہمیت

(۲)

بحیثیت مجموعی حج کن کن اسرار واعتبارات کا حامل ہے؟

سب سے پہلے حج کے متعلق سمجھنے کی چیز یہ ہے کہ دین میں اس کی اہمیت اور مرتبہ کیا ہے؟ پھر اس کے لیے قلب و ذہن میں شوق وعشق کی ایک دنیا بیدار کرنے اور بسانے کا مسئلہ ہے اس کے بعد عزم وارادہ میں تحریک پیدا کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ پھر یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ کون کون علائق ایسے ہیں جو اس راہ میں مانع ہیں اور ان پر قابو پانے اور ان سے رستگاری حاصل کرنے کا کیا طریق ہے۔ پھر جب یہ ابتدائی منزلیں طے ہو چکیں تو پھر احرام کا کپڑا خریدا جائے۔ زادِ راہ کا اہتمام کیا جائے۔ اور یہ دیکھا جائے کہ راحلہ یا سواری کا کیا بندوبست ہوگا۔ اس کے بعد اللہ کا نام لے کر بس چل کھڑا ہونا چاہیے اور بادیہ پیمائی کے لیے طیار ہو جانا چاہیے۔ پھر جب میقات کا سامنا ہو تو احرام باندھنا چاہیے۔ اور تلبیہ کا التزام کرنا چاہیے۔ پھر اس مرکز شوق یعنی مکہ مکرمہ میں پہنچ کر ان تمام افعال کو پورا کرنا ضروری ہے جو کتب حدیث وفقہ میں مذکور ہیں۔ یہ سب امور حج کے لوازم ہیں اور ان میں ایک ایک ایسا ہے کہ اس میں تذکرہ وعبرت کے نشان ہیں۔ تنبیہہ و اشارہ کے علائم ہیں۔ شرط یہ ہے کہ طبیعت نصیحت پذیر رہے۔ ارادہ صادق اور مخلص ہو۔ اور روحانیت وفطانت سے بہرہ وافر ملا ہو۔ چند لفظوں میں اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم اس کے اسرار کے بارے میں کچھ اصول اور بنیادی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کی اہمیت اگر سطح ذہن پر مرقوم ہو گئی تو بقیہ تمام اسرار ورموز کا سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔

وصول الی اللہ کی اہمیت

اب اس سلسلہ کی بنیادی چیز حج کے مقام و موقف کی وضاحت ہے۔ اور اس وضاحت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیا جائے کہ ہماری ساری دینی جد و جہد اور تگ و تاز کا مقصد وصول الی اللہ ہے۔ پھر جب یہ حقیقت اچھی طرح ذہن میں آجائے تو وصول الی اللہ کے اس طریق کا سراغ لگانا چاہیے جس پر چل کر ہر دور میں اتقیاء و صلحاء کامیابی و کامرانی کی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔ جب اس نقطۂ نگاہ سے حقیقتِ ادیان کا کھوج لگایا جائے گا تو یہ بات نکھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ نعمت بجز شہوات و خواہشاتِ نفسانی سے کنارہ کش ہونے کے حاصل ہونے والی نہیں۔ جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہے کہ جب تک کوئی شخص تکلفات سے ہٹ کر ضروریات پر قناعت اختیار نہیں کرتا اور اپنی تمام حرکات و سکنات کا رخ اللہ کی طرف نہیں پھیر دیتا۔ اس وقت تک اس رتبۂ بلند پر فائز نہیں ہو سکتا۔

یہی وہ نکتہ تھا کہ جس کی طرف گذشتہ امتوں کا ذہن منتقل ہوا اور انہوں نے وصول الی اللہ کی خاطر دنیا کے اسباب و وسائل کو یکسر تج دیا۔ اور پہاڑوں اور جنگلوں کی راہ لی۔ اور مخلوق سے اگرچہ بیزار ہوئے مگر خالق سے انس و محبت کے رشتوں کو استوار کر کے رہے۔ یہی وہ عابد و زاہد ہیں کہ قرآن نے جن کی تعریف فرمائی ہے:

ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔

یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

ان لوگوں نے آخرت کی راہ میں بڑے بڑے مجاہدے کیے۔ مشقتیں جھیلیں اور اللہ کی محبت میں نفس کی ہر ہر لذت کو چھوڑا۔ اور تکلف و آسائش کی ہر ہر صورت سے انحراف کیا۔

پھر ایک دور ایسا آیا کہ اخلاص و تجرد کے یہ جذبات سرد پڑ گئے۔ خشوع و خضوع کا یہ طریق اپنی افادیت کھو بیٹھا۔ اور اللہ کی مخلوق اس کی ذات ستودہ صفات کی طرف رجوع ہونے کے بجائے شہوات و خواہشات پر ٹوٹ پڑی۔ اس وقت شانِ ربوبیت نے اصلاح و ہدایت کے

لیے آں حضرتؐ کو مبعوث فرمایا۔

اسلام میں رہبانیت کا بہترین بدل حج و جہاد ہے

تمام انبیاء کا مقصد اصلاح و ہدایت تھا اور آپؐ کے سامنے بھی چونکہ یہی نصب العین تھا کہ خلق اللہ کو از سر نو طریق آخرت پر گامزن ہونے کی دعوت دی جائے اور انبیاء و رسل کے سنن کو تازہ کیا جائے۔ غرض اس کے لیے آپؐ نے اسلام کے نام سے ایک لائحہ عمل پیش کیا جس سے یہ نصب العین اچھی طرح پورا ہو سکتا تھا۔ لیکن کیا یہ لائحہ عمل پہلوں کی طرح رہبانیت لیے ہوئے تھا؟ نہیں یہ مجاہدہ و عمل کی ایک دوسری ہی صورت تھی جو ترک دنیا سے بہت مختلف تھی۔ چنانچہ آپؐ سے پوچھا گیا کہ کیا آپؐ کے دین میں سفر و بادیہ پیمائی کی اجازت ہے اور آپؐ دنیا سے علاحدگی کو جائز سمجھتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

ابدلنا اللہ بھا الجھاد والتکبیر علی کل شرف — اللہ نے رہبانیت کے بدلے ہمیں جہاد و حج کی نعمتوں سے مشرف فرمایا ہے۔

سیاحت و جنگلوں میں گھومنا پھرنا جو رہبانیت کا ایک ضروری جز ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

ھم الصائمون۔ — میری امت کے سیاح روزہ رکھنے والے ہیں۔

گویا اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی سے امت کو رہبانیت کے شدائد سے بچا لیا ہے اور اس کے عوض وہی اجر، وہی ثواب اور وہی اخلاص و یکسوئی اور وہی ایثار حج کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ بیت عتیق کو اپنی ذات پر دلالت کناں ٹھہرایا۔ اور اپنے بندوں کو حکم دیا کہ اس کو اپنا مقصود اور منزل سمجھیں۔ اور شوق و ذوق سے دور و دراز کا سفر طے کر کے اور سفر کی صعوبتیں جھیل کر پہنچیں اور اس کی زیارت و طواف سے بہرہ مند ہوں۔ پھر اس کے تمام گرد و پیش کو حرام قرار دیا۔ اور شکار وغیرہ کی ممانعت کی۔ اور حاضری کے لیے اسی طرح کی وضع و کیفیت اور ادب و احترام متعین کیا جو زائرین بڑے بڑے بادشاہوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ دل میں اس کی جلالت قدر اور عظمت کا نقش بیٹھے۔

اور ان میں اپنی عاجزی، انکسار اور عبودیت کا احساس نشو ونما پائے۔

کعبہ پر بیت اللہ کا اطلاق بطور رمز و اشارہ کے ہے

بیت اللہ کی عظمت و اہمیت پر غور کرتے وقت اس کے متعلق یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ رمز و اشارہ کے طور پر یہ مقصود و نصب العین ہے تاکہ شوق و وارفتگی کی کیفیات کو اس کی وجہ سے ابھارا جا سکے۔ لیکن اس سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ذاتِ خداوندی کو کوئی چار دیواری گھیر سکتی ہے یا کوئی شے اس کی صمدیت کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اعمال حج میں اصل شے اپنی عبودیت و غلامی کا غیر مشروط طور پر اعلان ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان میں کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر عقل و فکر کی گرفت میں آنے والی نہیں۔ یہی نہیں نفس و قلب کو ان سے کسی طرح کی موافقت اور دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی یا رمی جمار ایسی رسمیات اسی قبیل سے ہیں۔ ان کی تہ میں بجز اطاعت و فرمانبرداری اور بجز عبودیت و غلامی کے اقرار و اعتراف کے اور کوئی حقیقت مضمر نہیں۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیجیے کہ دوسری تمام عبادات ایسی ہیں کہ ان میں نفس و روح کی دلچسپی کا اچھا خاصا سامان موجود ہے۔ مثال کے طور پر روزہ کو لیجیے اس میں اگرچہ ایک گونہ کلفت پائی جاتی ہے۔ لیکن تسکین کا یہ عظیم پہلو بھی تو موجود ہے کہ اس سے شہوات کا زور ٹوٹتا ہے۔ یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور نفس انسانی خواہشات و جذبات کی سطح سے اونچا اٹھتا اور ملکیت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اسی طرح نماز کو دیکھیے کہ اس میں رکوع و سجود کی کیفیتیں کس درجہ پُر معنی ہیں۔ ان سے تواضع کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کی عظمت و اجلال کا تصور ابھرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام کیفیتیں ایسی ہیں کہ دل و دماغ ان سے مانوس ہے۔ بخلاف صفا و مروہ کے دوڑنے کے اور جمرات کو کنکریاں مارنے کے کہ ان میں نفس و قلب کے لیے دلچسپی کا بظاہر کوئی سامان نہیں۔

رسمیاتِ حج کا فلسفہ

عبادت کی یہ نوعیت جو عقل و دانش کی گرفت میں نہ آسکے اس لیے اسلام نے ضروری ٹھہرائی تاکہ انسان میں اطاعت محض کا تصور پیدا کیا جائے اور اسے بتایا جائے کہ اللہ تعالےٰ کے اتباع

وفرمانبرداری میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں عقل و ادراک کی رہنمائی سے دست کش ہونا پڑتا ہے اور ایک کام صرف اس لیے انجام دینا پڑتا ہے کہ پروردگار کو پسند ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان میں اللہ کی غلامی، اس کی بندگی اور اطاعت کے جذبات اس درجہ نمایاں ہوں کہ وہ اس کی پکار اور دعوت پر طبیعت و نفس کے رجحان کو نہ دیکھے۔ نہ عقل و فہم کے اشارات کا انتظار کرے بلکہ خود اس دعوت، اس امتحان اور اس آزمائش میں اتنی لذت پائے اور اتنی معقولیت و وزن محسوس کرے کہ عقل و خرد کی تائیدات کی ضرورت ہی نہ رہے۔ ادھر ندائے الٰہی کان میں پڑے اور ادھر یہ بندہ مطیع لبیک کہہ کر اطاعت پر کمربستہ نظر آئے۔ یہ اس لیے کہ اگر اطاعت و انقیاد کا یہ مقام بلند حاصل نہ ہوا اور انسان عقل و بصیرت کی رہنمائیوں کا اسی طرح دست نگر رہا اور نفس و طبیعت نے اسی آواز پر کان دھرا، اور اسی دعوت کو قبول کیا تو پھر کمالِ عبودیت کا وہ مرتبہ تو حاصل نہ ہو سکا جہاں اطاعت محض اطاعت کی خاطر، اور بندگی صرف بندگی کے لیے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شرف مناسک حج کو بخشا ہے کہ اس کے ذریعہ اطاعت کے اس تصور کی تکمیل ہو پائے جس میں عقل و فکر کی مجبوریوں کو کوئی دخل نہیں اور جو اللہ کے احکام کو بجائے خود اتنا مؤثر اور اس درجہ لائقِ توجہ قرار دیتا ہے کہ سوائے ماننے اور عمل کرنے کے چارہ نہیں۔

مزید براں اسلام نے رسوم حج اور مناسک حج کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ داعیاتِ عقل سے اس بے گانگی کو اس لیے بھی روا رکھا کہ انسانی اعمال کی سطح کو ہوائے نفس کی سطح سے اونچا رکھا جا سکے۔ اور اللہ کے بندوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ ان کی باگ اور ان کی زمام شریعت کے ہاتھ میں ہے۔ عقل و خرد اور جذبہ و خواہش کے ہاتھ میں نہیں۔ تاکہ ان کی روزمرہ کی زندگی اسی اصول پر چلے اور اسی سانچے میں ڈھلے۔

داعیاتِ شوق کے تقاضے

یہ تو ہوا مناسک حج کے بارے میں عمومی نقطۂ نظر جس سے کہ اس کی اہمیت و مقام کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس کے بعد شوق کا مرتبہ ہے یعنی جب یہ فلسفہ ذہن کے ہر ہر گوشہ پر استیلا حاصل کرے

تو اب داعیاتِ شوق کو اکسانا چاہیے اور یہ فرض کرنا چاہیے کہ پتھر کی یہ چار دیواری مالک الملک کا گھر ہے اور جو اس کے لیے دور دراز کی مسافتیں طے کر کے آتا ہے۔ مال کو خرچ کرتا ہے۔ اور جان کو جوکھوں میں ڈالتا ہے اس دنیا میں وہ گویا لقائے الٰہی کا متمنی ہے۔ پھر جس درجہ اس دنیا میں یہ خیال قلب و ذہن پر قابو پائے گا۔ اور اللہ تعالےٰ سے ملاقات کرنے اور اسے دیکھنے کا جذبہ بڑھے گا اسی نسبت سے دارالجزاء میں اللہ تعالےٰ کے دیدار سے بہرہ مند ہوگا۔ یوں اس کی رحمتیں یہاں بھی بے تاب ہیں اور یہاں بھی جلوہ فرمائی سے کسی طرح سے دریغ نہیں۔ مگر آنکھیں کہاں ہیں جو دیکھ سکیں اور اس کے جمالِ جہاں سوز کی تاب لا سکیں۔

دیکھنے کا یارا اور دید کی صلاحیتیں تو صرف اس وقت پیدا ہوں گی جب سرمہ شوق آنکھوں کو جلا بخشے گا۔ اور اس گھر کی زیارت اور لقاء سے دل سرور حاصل کرے گا۔ حج بیت الحرام تو اس کی ذات اور اس کی محبت سے ایک گونہ تعلق کا نام ہے۔ اور عاشقِ صادق جب اس تعلق میں پختہ ہو گا اور بایں شوق اور بایں داعیہ اس کا طواف کرے گا اور لبیک لبیک کی صدائیں بلند کرے گا اور یہ سمجھے گا کہ دیارِ محبوب کے گرد گھوم رہا ہے اور اس کی گلی کوچے کی سیر میں حیران و سرگرداں ہے تو یہ نسبت شوق دارِ آخرت میں اس کی رہنما ہو گی۔ اور حسبِ وعدہ یہ دیدار و لقاء سے سرفراز ہو کر رہے گا۔

شوق کے بعد عزم

جب شوق کا یہ مرحلہ طے ہو جائے اور دل و دماغ اس کی شمیم انگیزیوں سے معطر ہو جائے تو اس کے بعد پھر عزم اور اس کے تقاضوں کا درجہ ہے۔ مگر یہ عزم کیا ہے؟ یہ نام ہے تجدیدِ اخلاص کا۔ یعنی اس داعیہ کا کہ ایک حاجی بیت اللہ کے مقصد و ارادہ سے نکلے اور اہل و عیال اور وطن کی مفارقت برداشت کرے۔ تو یہ سمجھ لیجیے کہ اس کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے اور اس عظیم مقصد کو کسی قیمت پر بھی یہ ریا و شہرت کی آلائشوں سے داغدار نہیں ہونے دے گا۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کیا برائی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص گھر سے تو بظاہر اس نیت سے روانہ ہو

کہ کعبہ تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ اس کی حرمت و احترام کو قائم رکھنا ہے۔ اور اس کی زیارت سے دیدہ و دل کی ٹھنڈک کا سامان مہیا کرنا ہے مگر بباطن مقصود کوئی دوسری ہی شے ہو۔ حج کے معاملہ میں یہ ریاکاری اس کے سارے اجر کو برباد کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے اس سے احتراز ضروری ہے۔

قطع علائق کی منزل اور زادِ راہ کی نوعیت

آخر میں قطع علائق کی نوبت آتی ہے۔ اور قطع علائق کے یہ معنی ہیں کہ انسان تمام واجب الادا چیزوں کی طرف سے یکسو ہو جائے اور جو جس کو دینا ہے دیدے۔ اور جو لوٹانا ہے لوٹا دے اور ہر ہر معصیت سے تائب ہو کر حج بیت اللہ کا قصد کرے۔ کیونکہ اگر کوئی واجب الادا شے ادا نہ ہوئی یا ہر ہر برائی سطح دل سے نہ مٹی اور شوقِ معصیت کا وہی عالم رہا تو پکارنے والا پکار کر کہے گا۔ ظالم! تو مالک الملک کے دربار میں حاضری دینے کی غرض سے پا برکاب ہے۔ اور اپنے اجر و ثواب کی ساری پونجی یہیں ضائع کر دینے پر تلا بیٹھا ہے۔ کیا دل کی اس کیفیت پر تمہیں شرم نہ آئے گی۔ کہ اس حال میں اس کے حضور اپنے کو پیش کرے کہ دل نے ابھی علائق سے رستگاری حاصل نہیں کی بلکہ گناہوں سے رغبت و شوق کے رشتے اسی طرح قائم ہیں۔ اور پیچھے کا خیال بھی بدستور دامنگیر ہے۔ اس صورت میں حج کی برکات تو کیا حاصل ہوں گی بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ کہیں علاوہ مالی نقصان اور جسمانی تکالیف کے دربار خداوندی سے نکال باہر نہ کیے جائیں۔

مکمل قطع علائق کا یہ مطلب ہے کہ اس سفر کو سفرِ آخرت سمجھے اور جو وصیت کرنا ہے کر جائے کیونکہ کون جانتا ہے کہ پھر مراجعت وطن کی نعمتیں حاصل ہوں گی یا نہیں۔

یہاں تک جن منازل کا تعلق تھا وہ قلب و ذہن سے تعلق رکھتی ہیں جب یہ سب سطے ہو چکیں تو پھر زادِ راہ کی فکر کرنی چاہیے اور اس میں اس پہلو کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ یہ زادِ راہ سراسر حلال و طیب مال پر مشتمل ہو۔ ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ پھر یہاں ایک نکتہ اعتبار ہے اور وہ یہ کہ جس طرح اس زاد کے سلسلہ میں ایسی ہی چیزیں عموماً منتخب کی جاتی ہیں

جو راستہ میں آب و ہوا کی تاثیر سے خراب نہ ہوں اور آخری منزل تک برقرار رہیں۔ ٹھیک اسی طرح سفرِ آخرت کے لیے بھی ایسے ہی توشہ اور زاد کی حاجت ہے کہ جو احوالِ قبر تک ساتھ دے سکے اور ریا و شہرت کی آمیزشوں سے جس میں بگاڑ یا فساد کی بو نہ پائی جائے۔

سواری کا اہتمام

زادِ راہ کے بعد راحلہ یا سواری کی تلاش ہوگی۔ جب سواری سامنے آئے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے یوں سفر کی آسانیوں کا اہتمام فرمایا۔ اور حیوانات کو اس کے تابع فرمان کرایا۔ اس مرحلہ پر بھی اسے اس خیال کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ سفر عقبیٰ کی طرف ایک قدم ہے یہ اس کی تمہید اور طیاری ہے۔ پھر جس طرح سفرِ حج کے لیئے ایک مضبوط اور مناسب سواری کی ضرورت ہے اسی طرح دور دراز کی اس مسافت کے لئے بھی ایک سواری چاہیئے جس پر اس کا جنازہ اٹھے۔ اور کامیابی اور کامرانی سے اللہ کے دربار میں پہنچایا جائے مگر عقبیٰ کی یہ سواری لحم و شحم کی سواری نہیں اور گوشت و پوست کی مرکب نہیں۔ بلکہ اعمال و ایمان کی سواری ہے۔

لہٰذا ہمیں ہر طرح اطمینان کر لینا چاہیئے کہ اس کے اعمال و ایمان اس معیار اور انداز کے ہیں کہ اللہ کے ہاں اسے سرخ روئی کے ساتھ پہنچا سکیں۔ عقبیٰ اور آخرت کا یہ خیال اور تیاری ہر ہر منزل اور موڑ پر اس لئے ضروری ہے۔ کہ اس سے ہر شخص کو دوچار ہونا ہے۔ اور اس سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ علاوہ ازیں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ حج کا یہ سفر یا دوسرے سفر تو محض مرتبہ تک ہی میں ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہو اور ہو سکتا ہے کہ اونٹ پر سوار ہونے سے پہلے ہی کو موت آجائے پھر جب اس منزلوں سفر کے لئے ایک گونا طیاری اور اہتمام میں فکر و تردد ضروری ہے۔ تو اس سفر کے لئے کہ جو قطعی اور یقینی ہے کیوں اہتمام نہ ہو۔

احرام دراصل کفن ہے

احرام کی چادریں خریدے تو کفن کا تصور دیدۂ عبرت کے سامنے لائے۔ اور کچھ اس طرح کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جائے کہ اسے اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے۔ اور یہ لباس اسی حاضری کی تیاری ہے۔ جس طرح حج کا یہ لباس عام ملبوسات سے مختلف ہے اور یہ وضع صبح و شام کے پہناوے سے الگ اور جدا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں جانے کا بھی اسی نوع کا پہناوا ہے۔ نہ جس کو سیا جاتا ہے اور نہ جو سوئی اور تاگے کا رہین منت ہے۔

شہر سے نکلے تو یہ سمجھے کہ اس نے بال بچوں کی جو جدائی گوارا کی ہے۔ احباب کو چھوڑا ہے۔ اور گھر اور وطن کو خیرباد کہا ہے۔ اس کی دنیاوی غرض کے لیے نہیں بلکہ محض اس مالک الملک کی خاطر اور یہ یقین رکھے کہ یہ سفر دنیاوی سفروں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ یہ اپنے مقاصد نصب العین اور جلالت قدر کے اعتبار سے ان سب پر فائق ہے۔ اس راہ کا راہی وہ ہے جس کو پکارا گیا۔ اور اس نے اس پکار کو دل کے کانوں سے سنا۔ جس کے دل میں شوق و محبت کے جذبات کو ابھارا گیا اور وہ ان جذبات کے زیر اثر چل کھڑا ہوا۔ جسے قطع علائق پر آمادہ کیا گیا اور وہ اس پر دل و جان سے آمادہ ہو گیا۔ گویا یہ اس پاکباز زمرۂ زائرین میں شمار ہوتا ہے جس نے علائق سے منہ موڑا اور رب البیت کی دید کے لیے تمام مشقتوں اور مشکلوں کو برداشت کیا۔

ان جذبات و مقاصد کو لیے ہوئے جب ایک آدمی اپنے شہر سے روانہ ہو تو اسے پرامید رہنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ وہ منزل مقصود تک پہنچا ہی دے گا۔ اس بنا پر نہیں کہ اس کے اعمال اس قابل ہیں کہ ان کا لحاظ کیا جائے یا اس کا یہ جذبہ اس لائق ہے کہ اس کی تکمیل ہونی چاہیے۔ بلکہ محض اس بنا پر کہ اس کا فضل و کرم اس کا مقتضی ہے۔ ہاں اس رضا کے ساتھ ساتھ موت کا ڈر اور ہول بھی دل سے نکال دینا ضروری ہے۔ کہ اس کے لیے کوئی وجہ جواز پائی نہیں جاتی۔ کیونکہ موت اس کے سوا اور کیا ہے کہ جس گھر کے قصد سے نکلے ہیں اب اسی کے گھر جا رہے ہیں۔ اور پھر اس کا یہ وعدہ بھی ہے:

ومن یخرج من بیتہٖ مھاجراً الی اللّٰہ و رسولہٖ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہٗ علی اللّٰہ

اور جو شخص خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے پھر اس کو موت آپکڑے تو اس کا ثواب اس کے ذمے ہو چکا۔

سفرِ حج اور سفرِ آخرت کی کیفیات میں مماثلت

بادیہ میں قدم دھرے اور اس کے لق و دق صحراؤں کو طے کرے تو اس کی ہولناکیوں کو سفرِ آخرت کی ہولناکیوں پر قیاس کرے۔ اور یہ خیال کرے کہ جس طرح یہاں ہر لحظہ پکڑے جانے اور گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے اسی طرح آخرت کی پہلی ہی منزل قبر میں نکیرین کے سوالات کا اندیشہ ہے۔ پھر جس طرح یہاں درندے اور بچھو اور سانپوں کی کثرت ہے اسی طرح قبر میں بھی بے شمار حشرات الارض ایسے ہو سکتے ہیں جو جسمِ انسانی کو لپٹ جائیں۔ اور ڈسیں۔ اسی طور پر بادیہ کی وحشت کو قبر کی وحشت قرار دے۔ اور یہاں کے ہر ہر خوف و خطر کو خطراتِ مستقل میں بدل دینے کی کوشش کرے۔ احرام و تلبیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان نے اللہ کی دعوت قبول کر لی ہے اور اس کی پکار سن لی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ احرام باندھنے اور لبیک کہہ دینے سے واقعی اس کا دل اللہ کے دربار میں حاضر ہو گیا ہے اور اس کی اس حاضری کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا بھی گیا ہے۔ اس لیے جہاں یہ لبیک لبیک کی دل نواز صدائیں بلند کرے وہاں اپنے کو رجاء و خوف کے بین بین محسوس کرے اور اس اندیشہ سے برابر دل کو مشوش بھی رکھے کہ مبادا اس کے جواب میں یہ نہ کہہ دیا جائے کہ تمہارا یہ تلبیہ ہمیں منظور نہیں۔

سفیان بن عیینہ کی تاثر پذیری

سفیان بن عیینہ کی روایت ہے کہ علی بن حسین نے حج کا قصد کیا۔ جب احرام باندھا اور اونٹنی پر سوار ہوئے تو چہرہ فق ہو گیا۔ رنگ زرد پڑ گیا۔ اور سارے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ باوجود انتہائی کوشش کے بھی منہ سے لبیک لبیک کے کلمات نہ نکل سکے۔ لوگوں

نے پوچھا آپ تلبیہ کیوں نہیں کہہ رہے ہیں۔ فرمایا۔ ڈرتا ہوں کہ مبادا لبیک کے جواب میں لا لبیک نہ کہہ دیا جائے۔ اور ایک مرتبہ تو ہمت کر کے لبیک کہہ بھی دیا۔ لیکن فوراً غش کھا کر گر پڑے۔ روائت میں ہے کہ دورانِ حج میں ان کی برابر یہی کیفیت رہی۔

احمد بن ابی الحواری کا کہنا ہے کہ اسی قسم کا قصہ ابوسلیمان امدارانی کا بھی منقول ہے۔ انہوں نے احرام باندھا اور ایک میل تک چلے۔ لیکن تلبیہ نہ کہہ پائے۔ یہاں تک کہ ان پر بے ہوشی طاری ہوئی۔ ہوش آیا تو کہنے لگے۔ اے احمد! ایک مرتبہ حضرت موسیٰ سے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے ظالموں سے کہہ دو کہ میرا کم ہی ذکر کریں۔ اور یہ اُٹھتے بیٹھتے محض ریاکاری سے میرا نام نہ لیں۔ کیونکہ میں ان کی حرکتوں سے بہت بیزار ہوں۔ اور ان کے مشغلۂ ذکر پر انہیں اپنی رحمتوں سے اور دُور کر دیتا ہوں۔

احمد! جو شخص ناجائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال سے حج کرتا ہے اس کے تلبیہ پر اسے یہی جواب ملتا ہے کہ میں تیرے تلبیہ کو قبول کرنے والا نہیں۔ جب تک تو ناجائز مال کو حقداروں کو واپس نہ لوٹا دے۔

جب حدودِ مکہ میں داخل ہو تو اس وقت اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے حرم تک رسائی کی توفیق بخشی۔ پھر جس طرح یہ اس کے گھر میں امن و اطمینان سے پہنچ گیا ہے۔ اسی طرح توقع رکھے کہ آئندہ بھی اس کے عتاب سے محفوظ رہے گا۔ اکثر حالات میں تو اسے پُر امید ہی رہنا چاہیے کیونکہ پروردگارِ عالم کا کرم عام ہے اور اس کی بخششوں کی کوئی حد و انتہا ہی نہیں۔ لیکن اس قربِ مکانی پر اپنے کو اس کا اہل بھی ثابت کرنا چاہیے۔ اور سمجھ لینا چاہیے کہ اگر اس نے اس قرب کے حدود کا خیال نہ کیا۔ اس سے لطف اندوز نہ ہوا۔ اور اس کے آداب کو مرعی و ملحوظ نہ رکھا تو قربِ ذات کا تحمل کیونکر ہو سکے گا۔

طواف ایک نوع کی نماز ہے

جب بیت اللہ کا سامنا ہو، اور نظریں بیت اللہ کی چار دیواری پر پڑیں تو

دل پر اس کی عظمت کا گہرا نقش ابھر آنا چاہیے اور امید رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس کے گھر کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ اسی طرح عرصۂ قیامت میں خود اس کی زیارت سے بہرہ مندی ہو گی۔ بیت اللہ کا احترام و اجلال اسی انداز سے ہونا چاہیے کہ گویا حجّی الوسع تم اللہ کے سامنے کھڑے ہو۔ اسی ڈر، اسی رعب، اور اسی اخلاص و نیازمندی کا اظہار ہونا چاہیے کہ جو اس مناسبت پر ضروری ہے۔ حج کے یہ مبادی اور یہ مناسک چونکہ سب کے سب احوالِ آخرت سے حد درجہ مشابہت رکھتے ہیں اس لیے ہر ہر لمحہ اور موڑ پر آخرت کی کیفیات کو سامنے رکھنا چاہیے۔

طواف ایک نوع کی نماز ہے۔ اس لیے اس میں وہی خوف، رجاء اور تعظیم و محبت ہونا چاہیے جو نماز کی خصوصیات ہیں۔ یہ بیت اللہ کے گرد چکر، یہ اللہ کے گھر کے گرد پھیرے۔ دراصل تشبیہ ہے ان ملائکہ کے ساتھ جن کے طواف کا مدار و محور عرشِ الٰہی ہے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ جسمانی حرکت ہے۔ اور طواف سے مراد کعبہ کے گرداگرد جس میں جسم کی ایک دوڑ ہے بلکہ یہ روح کا ایک طواف ہے اور قلب و فکر کے پھیرے ہیں۔ اس لیے ان کا آغاز بھی ذکرِ رب سے ہونا چاہیے اور اختتام بھی اس پر ہونا چاہیے۔ بیت اللہ کے بارے میں اس حقیقت کو مدِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ یہ دنیا میں بمنزلہ ایک مثال اور رمز کے ہے۔ اور اس سے مراد ایسا مرکزِ شوق و عشق ہے جو عالمِ ملکوت میں ہے۔ اور یہ آنکھیں اسے دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتیں۔ ہاں بعض مرتبہ اہلِ کشف پر اس کی گرہ کشائی البتہ ہوئی ہے۔ اور وہ حج کی صحیح روح کو اپنانے کی وجہ سے اس کے دیدار اور طواف سے ضرور مالا مال ہوئے ہیں۔ ہر مرکزِ شوق و عشق وہی بیت معمور ہے جس سے متعلق بعض روایات میں اس انداز کے اشارات ملتے ہیں کہ اس کعبے کے مقابلے میں آسمانوں پر بھی ایک کعبہ ہے۔ جو ملائکہ کا محلِ طواف ہے۔ اور چونکہ ہر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ اس بیت معمور تک رسائی حاصل کر سکے اور اس کے گرداگرد ذکر و شوق کے چکر کاٹ سکے اس لیے اسے صرف اسی چیز کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے کہ اس بیت اللہ کا طواف کرے جو اس کے مشابہ ہے۔ اور اسی کی ترجمانی کرتا ہے۔

حدیث میں ہے :

من تشبّہ بقوم فہو منہم (۱) جو جن لوگوں کا تشبہ اختیار کرتا ہے وہ انہیں میں شمار ہوتا ہے۔

بیت اللہ اور بیت معمور سے بھی آگے کی ایک منزل

طواف کی ان منزلوں سے آگے کا بھی ایک مقام ہے جو لوگ اس طوافِ ظاہری کو اس ملکوتی و باطنی طواف کے ساتھ ملا دیتے ہیں اور ان ہی کیفیات کو قلب و ذہن پر طاری کر لیتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ زمین و آسمان کا کعبہ یا بیت معمور تو محض ایک رمز ہے۔ ہماری توجہات کا اصلی ہدف براہ راست اللہ تعالےٰ کی ذات ہے۔ تو یہ وہ خوش قسمت لوگ ہیں کہ خود کعبہ ان کا طواف کرتا ہے۔ اور ان کے گرد گھومتا ہے۔ جیسا کہ بعض اولیاء اللہ نے اپنے مشاہدات و مراقبات میں محسوس کیا ہے۔

حجرِ اسود کو بوسہ دینا

استلام یا حجر اسود پر بوسہ دیتے وقت یہ خیال رہنا چاہیے کہ یہ ایک نوع کی اطاعت ہے جس کا براہ راست تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کرنے والا اللہ تعالےٰ سے عہد کرتا ہے کہ آئندہ زندگی میں اس سے سرتابی و سرکشی کا ظہور نہیں ہو پائے گا۔ یہی مطلب ہے حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کا :

الحجر الاسود یمین اللہ عزوجل فی الارض یصافح بہا خلقہ کما یصافح الرجل اخاہ (۲)

حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے جس کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں سے اسی طرح مصافحہ کرتا ہے جس طرح ایک بھائی اپنے بھائی سے کرتا ہے۔ غلافِ کعبہ کو پکڑ کر اور درِ کعبہ سے لپٹ کر یہ سمجھنا چاہیے کہ قربِ الٰہی کے خواہاں اور جویاں ہیں۔ اور اس کی برکات کو حاصل کرنا اور

---

(۱) ابو داؤد (۲) عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے

اپنے میں سمونا ہے۔ نیز اس گھر کے مالک و آقا کے دامن کو پکڑ کر اس سے عفو و مغفرت کا طالب ہونا ہے۔ یہ فعل بعینہٖ اس شخص کا سا ہے کہ جو کسی دوست سے اپنی کسی لغزش اور غلطی پر مخلصانہ معذرت کرتا ہے اور معافی چاہتا ہے۔ اس لیے سائل کو چاہیے کہ اس کیفیت کو دل میں اچھی طرح راسخ کرے اور اللہ تعالےٰ سے بار بار گناہوں کی بخشش مانگے۔ اور اپنی دعاؤں میں یوں ظاہر کرے کہ گویا سوا اس کی ذاتِ گرامی کے اور کوئی ملجا و ماویٰ نہیں۔ کوئی ٹھکانا اور پناہ گاہ نہیں۔ اسی کے عفو و کرم پر بھروسہ ہے اور وہی اس لائق ہے کہ مستقبل کے امن و اطمینان کا ضامن و کفیل ہو۔

صفا و مروٰی کے مابین سعی کا مطلب

صفا و مروٰی کے مابین سعی اور بار بار آنے جانے کا مطلب یہ ہے کہ حج کی سعادت سے بہرہ مند ہونے والا ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اب اسے اپنے مالک اور رب کی رحمتوں کا شدید انتظار ہے۔ یہ اس تردد اور حیص بیص میں اس کے صحن خانہ کے چکر کاٹ رہا ہے کہ اس کی عبادت مقبول ہوئی یا نہیں۔ اس کی محنت اس کا ایثار اور عمل خود اس کی نظر میں کوئی وزن رکھتا ہے یا نہیں کہ جس کے لیے اس نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور جھیلا ہے۔ یا پھر یہ بے چینی اور تردد یوم حساب کی بے چینیوں کے مماثل ہے اور اس گھڑی کی یاد دلاتی ہے جب اعمال کی ترازو نصب کی جائے گی اور چشم زدن میں یہ بتا دیا جائے گا کہ عمل کے دونوں پلڑوں میں بھاری کون ہے۔ نیکیوں کا یا برائیوں کا۔ ظاہر ہے جب دل کی یہ کیفیت ہو تو بے چینی اور اضطراب کو رفع کرنے کے لیے چکر کاٹے ہی جاتے ہیں۔ یہ عین انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

میدانِ عرفہ مناظرِ قیامت کی تصویر ہے

عرفہ کے وسیع و عریض میدان میں ایک بھیڑ انسانوں کی ٹھہرتی ہے۔ بوقلموں آوازیں بلند ہوتی ہیں اور مختلف زبانوں میں دعائیہ کلمات ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی مناظرِ قیامت کی ایک تصویر ہے۔ اور عرصہ حشر کی ایک مثال ہے۔ جس طرح وہاں متعدد قومیں اپنے اپنے انبیاء کے

جھنڈوں تلے جمع ہوں گی۔ اور بخشش و شفاعت کے لیے چیخ و پکار کریں گی اسی طرح یہاں ایک ہنگامہ بپا ہے اور ہر ہر دل اور زبان پر عفو و طلب کا ورد ہے۔ اس مقام پر چاہیے کہ انسان کمال تضرع اور ابتہال سے کام لے۔ اور پختہ یقین رکھے کہ اس کی رحمتیں اس کو ڈھانپ کر رہیں گی اور اس کے فضل و کرم سے اس کو بے نیل و مرام واپس نہیں لوٹایا جائے گا۔ انشاء اللہ اس یقین کے ساتھ اگر یہ منزل طے ہوئی تو کامیابی مقدرات میں سے ہے۔ کیونکہ یہاں سوال صرف ان کی ایک دعا کا نہیں بلکہ یہ وہ موقع ہوتا ہے جب دنیا بھر کے ابدال و اوتاد کی ایک جماعت اس دعا میں شریک ہوتی ہے۔ ان سب کی نظریں اس کے باب اجابت پر مرکوز ہوتی ہیں اور ان کے دلوں سے مجموعی طور پر جو صدا بلند ہوتی ہے وہ یہی عفو و بخشش کی پُر اثر صدا ہوتی ہے اور دراصل اسرارِ حج کا ایک اہم سرّ یا اس کی خوش بختیوں کا ایک عظیم پہلو یہی ہے کہ اربابِ قلوب، احبابِ ہمم اور پاکیزہ ترین نفوس خدا جانے کہاں کہاں سے آکر یہاں جمع ہوتے ہیں اور جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فیوضِ صحبت و دعا کے اکثر مواقع ہر ہر شخص کو بغیر کسی تلاش و جستجو کے میسر آتے ہیں۔ یہ صحبت کس درجہ بابرکت ہے۔ اس کا اندازہ ایک عارف کے مندرجہ ذیل قول سے لگائیے کہ اس سے بڑھ کر محرومی کی اور کوئی صورت نہیں کہ عرفات میں حاضری کا اتفاق ہو اور یہ یقین حاصل نہ ہو کہ اللہ کی رحمتیں عام نہیں ہوں گی اور انسان یہاں سے خائب و خاسر ہو کر لوٹے گا۔

رمی جمار کا فلسفہ

رمی جمار یا کنکریاں مارنے کی رسم کا تعلق حضرت ابراہیم کی قائم کردہ رسم عشق و شوق کا اعادہ ہے۔ اس رسم کا تعلق حضرت ابراہیم کے ایک خاص واقعہ سے ہے۔ وہ جب مناسکِ حج میں مصروف ہوئے تو ان مقامات پر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ اندازی شروع کی۔ اور ان کو ادائے حج سے باز رکھنا چاہا۔ مگر وہ مردِ حق آگاہ اور مردِ حق پرست اس کے جھانسوں میں کب آنے والا تھا؟ انھوں نے اس کے جواب میں چند کنکریاں اٹھائیں اور اس کے منہ پر دے ماریں۔ جب سے یہ رسم عشق و شوق

قائم ہوئی کہ یہ ہر حج کرنے والا وساوسِ شیطان کے خلاف اظہارِ نفرت و بیزاری کے طور پر رمی جمار پر عمل پیرا ہو۔ اگرچہ اس کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو۔ اور اگرچہ اس کو بہکانے کے لیے شیطان اس کے سامنے نہ آئے۔ اس سے دو مقصد پورے ہوتے ہیں۔ ایک تو اس سے حضرت ابراہیمؑ کی سنّت تازہ ہوتی ہے اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت وامتثال کا یہ جذبہ کسی عقلی مجبوری کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور نہ کسی سمجھ میں آنے والے فلسفہ پر مبنی ہے۔ بلکہ یہ خالص عبودیت کا مظاہرہ ہے۔ اور شوق و وجدان کا تقاضا ہے۔ اس لیے جب جمرات کو ہدف ٹھہرانے کا یہ موقع میسر آئے تو فی الواقع یہ تصور قائم کرنا چاہیے کہ میں شیطان سے نبرد آزما ہوں۔ اور اس سے سخت بیزار ہوں۔ شیطان کے لیے اس سے زیادہ مایوس کن اور رسوا کن بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ محض نشۂ اطاعت میں سرشار ایسی ایسی رسموں میں بھی اطاعت و فرمانبرداری کا بڑھ چڑھ کر ثبوت دے رہا ہے جن سے بظاہر کوئی معقولیت وابستہ نہیں۔

قربانی کے جانور کا ذبح کرنا بھی من جملہ ان عبادات سے ہے کہ جن سے اللہ تعالےٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔

مدینہ یا مرکزِ عشّاق کے آداب اور احتیاطیں

ان سب مناسک سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے بہرہ مند ہونا ہے جو مرکزِ عشاق ہے۔ اس مرحلہ پر کن کن کیفیات کا دل میں ابھرنا ضروری ہے اور کن کن جذبوں کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جونہی نظریں اس کے در و دیوار پر پڑیں تو ذہن میں اس مبارک دَور کا تصور کرنا چاہیے جب اللہ تعالےٰ نے اس مقام کو آں حضرتؐ کا مہجر ٹھہرایا۔ اور جب اس بلادِ طیبہ کو یہ شرف بخشا کہ احکام و فرائض کی تبلیغ و اشاعت کا یہ منبع و سرچشمہ قرار پائے۔ یعنے یہیں آں حضرتؐ نے زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔ یہیں لوگوں کے سامنے اسوۂ حسنہ کی مثال قائم کی۔ اور یہی وہ مقام

ہے جہاں منکرین سے لڑائیاں ہوئیں اور جہاں فتح و نصرت کے دروازے آپ پر وا ہوئے۔ پھر یہی وہ جگہ ہے جو آں حضرتؐ کے جسدِ اطہر کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور یہی وہ خاکِ پاک ہے جس نے آپؐ کے دو وزیروں اور ساتھیوں کو شرفِ رفاقت سے نواز رکھا ہے۔

جب یہاں پہنچنے کی سعادت نصیب ہو تو یہ سمجھ کر اس کی گلی کوچوں میں قدم دھرنے چاہئیں کہ یہاں کے ہر پیچ و خم پر آں حضرتؐ کے نقوشِ پا کی شوخی جلوہ فرما ہے۔ لہٰذا یہاں چلو تو خوف، احتیاط اور احترام کے ملے جلے جذبات لیے ہوئے۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں گھومنے پھرنے میں آزادی نہیں۔ بلکہ یہاں اس خشوع اور اس کیفیت کو زندہ کرنا ہوگا جو آں حضرتؐ اپنی چال میں ملحوظ رکھتے تھے۔ اسی طرح چلنا ہوگا اور اس نقطۂ نظر سے اس کی گلی کوچوں کی سیر کرنا ہوگی۔ یہ مقامِ ادب ہے۔ اور اس نزاکت کا احساس برابر یہاں رہنا چاہیے کہ مبادا کسی گستاخی سے ہمارے اعمال ساقط الاجر اور بے مصرف نہ ہو جائیں۔

پھر ان لوگوں کی یاد دلوں میں آنا چاہیے جو آپؐ کے فیوضِ صحبت سے مشرف ہوئے۔ جنھوں نے آپؐ کے کلماتِ طیبات کو اپنے کانوں سے سنا۔ اور آپؐ کے روئے انور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس پر تاسف اور اظہارِ افسوس ہونا چاہیے کہ ہم ان مواقع سے محروم رہے۔ پھر یہ محرومی تو اس بنا پر گوارا بھی ہے کہ اس میں ہماری مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں۔ لیکن اس محرومی کے بارے میں سوچنا چاہیے جو اس وقت حاصل ہوگی جب ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے آں حضرتؐ سے کہا جائے گا کہ ان لوگوں کی سفارش کے لیے آپؐ بے تاب نہ ہوں۔ آپؐ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپؐ کے بعد کن کن بدعات کو اپنایا۔ اور دین کے نام پر کن کن خرافات کو سینے سے لگائے رکھا۔ اس وقت حضورؐ کو ہماری سفارش سے دست بردار ہونا پڑے گا اور کہنا پڑے گا۔

بعداً و سحقاً (۱) اگر ایسا ہے تو ان کا رحمتِ حق سے دور رہنا ہی اچھا ہے۔

---

(۱) متفق علیہ

ان خیالات کے ساتھ ساتھ رجاء و امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اور سمجھنا چاہیے کہ جس پروردگار نے حج کی توفیق بخشی ہے اور بغیر کسی دنیوی غرض کے گھر سے نکلنے کا موقع عطا کیا ہے۔ اس کی رحمتیں بغیر کسی رکاوٹ کے حاصل ہو کے رہیں گی۔

مسجدِ نبوی اور مزار پر حاضری کی کیفیات و آداب

جب مسجد نبوی کا منظرِ دلنواز سامنے آئے اور اس میں قدم دھرنے کی سعادت حاصل ہو تو کچھ اس طرح کا نقشہ نظر و بصر کے سامنے پھر جانا چاہیے کہ یہ وہ مقام ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے آں حضرتؐ کی سجدہ گاہ قرار دیا۔ جس میں مسلمانوں کے پہلے اور بہترین گروہ نے عبادت کے فرائض انجام دیئے۔ اور یہی وہ مقام ہے کہ زندہ حضرات میں سے بہترین اور چیدہ افراد جہاں صبح و شام اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ اور جو مرنے والوں میں سے بہتر اور اعلیٰ ترین ہستیوں کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا یہاں آنے کا جب اتفاق ہو تو خشوع و عظمت کے جذبات کا ان پر پورا پورا غلبہ و استیلاء ہونا چاہیے۔ اور کیوں نہ ہو یہ تو جگہ ہی ایسی ہے کہ ہر ہر دل جس سے متاثر ہو۔ اور ہر ہر مومن جہاں وفورِ کیفیات سے متحیر ہو۔ اویس قرنی کے بارے میں ابو سلیمان کی روایت ہے کہ جب یہ مدینہ آئے اور ان سے کہا گیا۔ یہ ہے آں حضرتؐ کی مزار۔ تو ان پر غش طاری ہو گیا۔ جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے۔ اللہ مجھے کسی طرح یہاں سے نکالیے۔ میں ایسی جگہ ہرگز نہیں رہنے کا کہ جہاں محمد رسول اللہؐ مدفون ہوں۔

مزار پر حاضری دینے کے آداب یہ ہیں کہ مومن نہ تو روضہ کی دیوار کے بالکل قریب کھڑا ہو اور نہ اس کو چھوئے۔ بلکہ ذرا فاصلہ پر ادب و احترام سے کھڑا ہو کر دیدۂ و نگاہ کے لیے سامانِ لذت فراہم کرے۔ اور یہ سمجھے کہ گویا آں حضرتؐ کی زندگی ہی میں ان کے سامنے حاضر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ان اللہ تعالیٰ وکل بقبرہ ملکا یبلغہ سلام من سلّم علیہ من امتہ۔ (۱)

---

(۱) نسائی۔ ابن حبان اور حاکم

اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی قبر پر ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جس کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ درود و سلام بھیجنے والے کا سلام و درود ان تک پہنچا دے۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رہے کہ درود و سلام تو اس شخص کا بھی آں حضرتؐ تک لے جایا جاتا ہے جو مدینہ سے باہر ہے اس لیے جس نے وطن اور ملک کو محض اس شوق کی بنا پر چھوڑا اور شدائد سفر برداشت کیے کہ آں حضرتؐ سے شرف ملاقات حاصل کرے گا۔ وہ اگر یہاں آکر روضۂ اقدس کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے اور درود و سلام کے تحائف بھیجتا ہے تو اس کے پہنچ جانے اور خلعت قبول پانے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آں حضرتؐ کو زائرین کے آنے اور زیارت کرنے کی باقاعدہ اطلاعات دی جاتی ہیں۔ روضۂ اقدس کی دیوار کو چھونا اور اس پر بوسہ دینا اس لیے ممنوع ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ کی سنت ہے جس سے مسلمانوں کو بہر حال مجتنب رہنا چاہیے۔

منبر رسولؐ دیکھ کر کس انداز کا نقشہ فکر و نظر کے سامنے ہو

اس کے بعد مسجد نبوی میں منبر رسولؐ کی زیارت کرنا چاہیے اور چشم تصور کے سامنے یہ منظر لانا چاہیے کہ گویا آں حضرتؐ اس پر تشریف فرما ہیں اور مہاجرین و انصار کے مختلف گروہ نے آپؐ کو گھیر رکھا ہے۔ آپؐ وعظ فرما رہے ہیں۔ اور ان میں اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی روح پھونک رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ اسرار و اعتبارات کہ مناسک حج میں جن کی رعایت ضروری ہے جب ان سے انسان فارغ ہو چکے تو اس کو اپنے قلب و جگر کا جائزہ لینا چاہیے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ کیا اس کا دل الٰہی کیفیات سے معمور ہے۔ کیا دنیا سے بیزار ہوا ہے اور دار البقا سے اس کی محبت بڑھی ہے۔ اور آیا اس کے اعمال شرع کی ترازو میں پورے اترتے ہیں۔ اگر یہ کیفیات دل میں موجود ہیں تو اس کا حج قبول ہوا اور اس کا نام زمرۂ محبوبین میں لکھا گیا۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو پھر اندیشہ ہے کہ کہیں اس کو سوا غضب و پشیمانی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس محرومی سے ہر ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ (تعلیمات غزالی)